

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْبَيْتِ

الْمَعَارِجُ

نام | تیسری آیت کے لفظ ذی الْمَعَارِج سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ اس کا نزول بھی قریب قریب اُنہی حالات میں ہوا ہے جن میں سورۃ الحاقہ نازل ہوئی تھی۔

موضوع اور مضمون | اس میں اُن کفار کو تنبیہ اور نصیحت کی گئی ہے جو قیامت اور آخرت اور دوزخ اور جنت کی خبروں کا مذاق اڑاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو اور تمہیں جہنم جلا کر ہم غلاب جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں تو لے آؤ وہ قیامت جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس سورۃ کی ساری تقریر اس چیلنج کے جواب میں ہے۔

ابتداء میں ارشاد ہوا ہے کہ مانگنے والا عذاب مانگتا ہے۔ وہ عذاب انکار کرنے والوں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا، اور جب وہ واقع ہو گا تو اسے کوئی دفع نہ کر سکے گا، مگر وہ اپنے دقت پر واقع ہو گا۔ اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ لہذا ان کے مذاق اڑانے پر صبر کرو۔ یہ اُسے دُور دیکھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

پھر بتایا گیا ہے کہ قیامت، جس کے جلدی لے آنے کا مطالبہ یہ لوگ ہنسی اور کھیل کے طور پر کر رہے ہیں کیسی سخت چیز ہے اور جب وہ آئے گی تو ان جبرین کا کیسا برا ہنسنے ہو گا۔ اُس دقت یہ اپنے بیوی بچوں، اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں تک کو قدرہ میں دے ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں گے تاکہ کسی طرح عذاب سے بچ سکیں، مگر نہ بچ سکیں گے۔

اس کے بعد لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اُس روز انسانوں کی قسمت کا فیصلہ ہر اس رُح کے عقیدے اور اخلاق و اعمال کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں حق سے منہ موڑا ہے اور مال سمیٹ سمیٹ کر اور سینت سینت کر رکھا ہے وہ جہنم کے مستحق ہوں گے۔ اور جنہوں نے یہاں خدا کے عذاب کا خوف کیا ہے، آخرت کو مانا ہے، نماز کی پابندی کی ہے، اپنے مال سے خدا کے محتاج بندوں کا حق ادا کیا ہے، بدکاریوں سے دامن پاک رکھا ہے، امانت میں خیانت نہیں کی ہے، عہد و پیمان اور قول و قرار کا پاس کیا ہے اور گواہی میں راست بازی پر قائم رہے ہیں وہ جنت میں عورت کی جگہ پائیں گے۔



أخربیں کہتے کہ ان کفار کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپ کا مذاق اڑانے کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹے پڑتے تھے، خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم نہ مانو گے تو اللہ تمہارے لئے جگہ دوں گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ ان کے دشمنوں کی پر واد نہ کریں، یہ اگر قیامت ہی کی ذلت دیکھنے پر مہر ہو تو انہیں اپنے ہیرو مشغلوں میں پھاڑنے دیں، مانتا ہر اہل انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔



آیاتھا ۴۴ سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ ذِكْرُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ۱ لِّلْكَافِرِيْنَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ۲ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۳ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ

مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے، (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے ہے، کوئی اُسے دفع کرنے والا نہیں، اُس خدا کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے۔ ملائکہ اور رُوح اُس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مدت ارب پچاس

۱۔ اصل الفاظ ہیں سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ نے یہاں سوال کو پوچھنے کے معنی میں لیا ہے اور وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے، کس پر واقع ہو گا؟ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ کافروں پر واقع ہو گا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ سوال کو مانگنے اور مطالبہ کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ نسائی اور دوسرے محدثین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ نُضْرُ بْنُ حَارِثِ بْنِ كَلْدَةَ نَسَى كَمَا تَقَالُ اللّٰهُ فَمَنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حَجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ اَوْ اَنْزِلْنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۵۔ (الانفال، آیت ۳۲)۔
”خدا یا اگر یہ واقعی تیری ہی طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے یا ہم پر دردناک عذاب لے آ“
اس کے علاوہ متعدد مقامات پر قرآن مجید میں کفار مکہ کے اس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: یونس، آیات ۶۷ تا ۶۸۔ الانبیاء، ۶۷ تا ۷۰۔ النمل، ۶۷ تا ۷۰۔ سبا، ۶۶ تا ۶۷۔ یس، ۵۵ تا ۵۶۔ الملک، ۲۴ تا ۲۵۔

۲۔ اصل میں لفظ ذِي الْمَعَارِجِ استعمال ہوا ہے۔ معارج، بضرع کی جمع ہے جس کے معنی زینے، یا سیڑھی، یا ایسی چیز کے ہیں جس کے ذریعے سے اوپر چڑھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو معارج والا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات بہت بالا و بزرگ ہے اور اس کے حضور بار بار ہونے کے لیے فرشتوں کو پے در پے بلند یوں سے گزرنا ہوتا ہے، جیسا کہ بعد والی آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

۳۔ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ملائکہ سے الگ اُن کا ذکر اُن کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ سورہ شعرا میں فرمایا گیا ہے کہ نَزَّلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰی قَلْبِكَ ۱۔ اس قرآن کو روح امین لے کر تمہارے

أَلْفَ سَنَةٍ ۝ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝ إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝ وَتَرَوْنَهُ

ہزار سال ہے پس اسے نبیؐ، صبر کرو، شانستہ صبر۔ یہ لوگ اُسے دُور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ
دل پر نازل ہوتے ہیں۔ اور سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ
کہو کہ جو شخص جبریل کا اس بیٹے دشمن ہو کہ اس نے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے۔ ان دونوں
آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ روح سے مراد جبریل ہی ہیں۔

۴ یہ سارا مضمون تشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جا سکتے۔ ہم نہ فرشتوں کی
حقیقت جانتے ہیں، نہ ان کے چڑھنے کی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں، نہ یہ بات ہمارے ذہن کی گرفت میں آ سکتی ہے
کہ وہ زمین کیسے ہیں جن پر فرشتے چڑھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی
خاص مقام پر رہتا ہے، کیونکہ اس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے منزہ ہے۔

۵ سورہ حج، آیت ۷۴ میں ارشاد ہوا ہے ”یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ
ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تم سے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہو کر آتا
ہے“ سورہ السجدہ، آیت ۵ میں فرمایا گیا ہے ”وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر اُس کی
رُوداد اور اُس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے“ اور یہاں
عذاب کے مطالبہ کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی گئی ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ جو لوگ فراق کے طور پر عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کی باتوں پر صبر کریں اور اس
کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اُس کو دُور سمجھتے ہیں اور ہم اُسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ ان سب ارشادات پر
مجموعی نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگ اپنے ذہن اور اپنے دائرہ فکر و نظر کی تنگی کے باعث خدا
کے معاملات کو اپنے وقت کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اور انہیں سو پچاس برس کی مدت بھی بڑی لمبی محسوس
ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ایک اسکیم ہزار ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اور
یہ مدت بھی محض بطور مثال ہے، ورنہ کائناتی منصوبے لاکھوں اور کروڑوں اور اربوں سال کے بھی ہوتے ہیں۔
انہی منصوبوں میں سے ایک اہم منصوبہ وہ ہے جس کے تحت زمین پر نوح انسانی کو پیدا کیا گیا ہے اور اس کے
لیے ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے کہ فلاں ساعت خاص تک یہاں اس نوح کو کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔
کوئی انسان یہ نہیں جان سکتا کہ یہ منصوبہ کب شروع ہوا، کتنی مدت اس کی تکمیل کے لیے طے کی گئی ہے، کونسی ساعت
اس کے انتہام کے لیے مقرر کی گئی ہے جس پر قیامت برپا کی جائے گی، اور کونسا وقت اس غرض کے لیے
رکھا گیا ہے کہ آغا ز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کو بیک وقت اٹھا کر ان

قَرِيبًا ۷ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ۸ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۹
وَلَا يَسْئَلُ حِمِيمًا ۱۰ يَبْصُرُونَ نُهُم يَوْمَ الْمَجْرِمِ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ

رہے ہیں۔ (وہ عذاب اُس روز ہوگا) جس روز آسمان گھیلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ
رنگ برنگ کے ڈھنکے ہوئے اُون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست
کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے

کا حساب لیا جائے۔ اس منصوبے کے صرف اُس حصے کو ہم کسی حد تک جانتے ہیں جو ہمارے سامنے گزر
رہا ہے یا جس کے گزشتہ ادوار کی کوئی جزوی سی تاریخ ہمارے پاس موجود ہے۔ رہا اُس کا آغاز و انجام، تو
اسے جانتا تو درکنار، اسے سمجھنا بھی ہمارے بس سے باہر ہے، لہذا ہم اُن حکمتوں کو سمجھ سکیں جو اس کے پیچھے
کام کر رہی ہیں۔ اب جو لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس منصوبے کو ختم کر کے اس کا انجام فوراً اُن کے سامنے
لے آیا جائے، اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو اسے اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ انجام کی بات ہی سرے سے
غلط ہے، وہ درحقیقت اپنی ہی نادانی کا ثبوت پیش کرتے ہیں مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن
جلد سوم، کلمح، حواشی ۹۲-۹۳۔ جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۱۹۔

۶ یعنی ایسا صبر جو ایک عالی ظرف انسان کے شایان شان ہے۔

۷ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ لوگ اُسے بعید از امکان سمجھتے ہیں اور ہمارے نزدیک
وہ قریب الوقوع ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کو بڑی دُور کی چیز سمجھتے ہیں اور ہماری
نگاہ میں وہ اس قدر قریب ہے کہ یا کل پیش آنے والی ہے۔

۸ مفسرین میں سے ایک گروہ نے اس فقرے کا تعلق فی یومہ کان مقداراً خمسين ألف سنة
سے مانا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کی مدت جس دن کی تباہی گئی ہے اُس سے مراد قیامت کا دن ہے۔
مُسند احمد اور تفسیر ابن جریر میں حضرت ابو سعید خدری سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے اس آیت کے متعلق عرض کیا گیا کہ وہ تو بڑا ہی طویل دن ہوگا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ”اس ذات کی قسم جس کے
ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے میں جتنا وقت لگتا ہے مومن کے لیے وہ دن اس سے بھی زیادہ
ہلکا ہوگا۔“ یہ روایت اگر صحیح سند سے منقول ہوتی تو پھر اس کے سوا اس آیت کی کوئی دوسری تاویل نہیں کی
جاسکتی تھی۔ لیکن اس کی سند میں دراج اور اس کے شیخ ابوالانعم، دونوں ضعیف ہیں۔

۹ یعنی بار بار رنگ بدلے گا۔

عَذَابٍ يَوْمَئِذٍ بَيْنِيهِ ۙ وَصَاحِبَتِيهِ وَأَخِيهِ ۙ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي
تُؤْيِيهِ ۙ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۙ كَلَّا إِنَّهَا لَأُظَى ۙ
نَزَاعَةٌ لِّلشَّوْىِ ۙ تَدْعُوا مِّنْ أَدْبُرٍ وَتَوَلَّى ۙ وَجَمَعَ فَأَوْعَى ۙ
إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۙ إِذْ أَمَسَهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۙ وَإِذَا مَسَّهُ

بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا، اور رُوئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں رکھے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلائے۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی، پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔ انسان ٹھنڈا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی

۱۱۰ چونکہ ہاٹوں کے رنگ مختلف ہیں، اس لیے جب وہ اپنی جگہ سے اکٹھا کر اور بے وزن ہو کر اُڑنے لگیں گے تو ایسے معلوم ہونگے جیسے رنگ برنگ کا ڈھنکا ہوا اون اڑ رہا ہو۔

۱۱۱ یعنی ایسا نہ ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہوں گے اس لیے نہ پوچھیں گے نہیں، ہر ایک آنکھوں سے دیکھ رہا ہو گا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا، کیونکہ اس کو اپنی ہی پڑی ہوگی۔

۱۱۲ یہاں بھی سورۃ الحاقہ آیات ۲۲-۲۳ کی طرح آخرت میں آدمی کے بڑے انجام کے دو وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔ ایک حق سے انحراف اور ایمان لانے سے انکار۔ دوسرے دنیا پرستی اور بخل، جس کی بنا پر آدمی مال جمع کرتا ہے اور اسے کسی بھلائی کے کام میں خرچ نہیں کرتا۔

۱۱۳ جس بات کو ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ ”یہ بات انسان کی سرشت میں ہے“ یا ”یہ انسان کی فطری کمزوری ہے“ اسی کو اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرماتا ہے کہ ”انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ قرآن مجید میں بکثرت مواقع پر نوع انسانی کی عام اخلاق کی کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے والے اور راہِ راست اختیار کر لینے والے لوگوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اور یہی مضمون آگے کی آیات میں بھی آ رہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پیدائشی کمزوریاں

الْخَيْرُ مِنْوَعًا ۚ ۲۱) إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۚ ۲۲) الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۚ ۲۳)
وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ۚ ۲۴) لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۚ ۲۵) وَالَّذِينَ

نصیب ہوتی ہے تو نخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے، جو

ناقابل تغیر و تبدل نہیں ہیں، بلکہ انسان اگر خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنے نفس کی اصلاح کے لیے عملاً کوشش کرے تو وہ ان کو دور کر سکتا ہے، اور اگر وہ نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو یہ اُس کے اندر راسخ ہو جاتی ہیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ام۔ جلد چہارم، الزمر، حواشی ۲۳-۲۸-الثوری، حاشیہ ۱۷۵)۔

۱۴ کسی شخص کا نماز پڑھنا لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب اور آخرت پر ایمان بھی رکھتا ہے اور اپنے اس ایمان کے مطابق عمل بھی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

۱۵ یہی کسی قسم کی شستی اور آرام طلبی، یا مصروفیت، یا دلچسپی اُن کی نماز کی پابندی میں مانع نہیں ہوتی۔ جب نماز کا وقت آ جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے خدا کی عبادت بجالانے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ کے ایک اور معنی حضرت عقبہ بن عامر نے یہ بیان کیے ہیں کہ وہ پورے سکون اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ کوسے کی طرح ٹھونگیں نہیں مارتے۔ مارا مار پڑھ کر کسی نہ کسی طرح نماز سے فارغ ہو جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نماز کے دوران میں ادھر ادھر التفات بھی نہیں کرتے۔ عربی محاورے میں پھیرے ہوئے پانی کو ماء دائم کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ تفسیر ماخوذ ہے۔

۱۶ سورہ ذاریات آیت ۱۹ میں فرمایا گیا ہے کہ "اُن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے" اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ "ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے" بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ مقرر حق سے مراد فرض زکوٰۃ ہے، کیونکہ اسی میں نصاب اور شرح، دونوں چیزیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ لیکن یہ تفسیر اس بنا پر قابل قبول نہیں ہے کہ سورہ معارج بالاتفاق مکی ہے، اور زکوٰۃ ایک مخصوص نصاب اور شرح کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔ اس لیے مقرر حق کا صحیح مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حصہ طے کر رکھا ہے جسے وہ اُن کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ یہی معنی حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، مجاہد، شعبی اور ابراہیم نخعی نے بیان کیے ہیں۔

سائل سے مراد پیشہ ور بھیک مانگنے والا نہیں بلکہ وہ حاجت مند شخص ہے جو کسی سے مدد مانگے۔ اور

۱۰۰ رِعُونَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِينَ هُمْ يُشْهَدُونَ قَائِمُونَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿۳۹﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿۴۰﴾ فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قَبْلَكَ مُطِيعِينَ ﴿۴۱﴾ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ﴿۴۲﴾

پاس کرتے ہیں، جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے۔

پس اے نبی! کیا بات ہے کہ یہ منکرین میں اور بائیں سے گروہ درگروہ تمہاری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں؟

۲۰ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۷۔

۱۱ امانتوں سے مراد وہ امانتیں بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے سپرد کی ہیں اور وہ امانتیں بھی جو انسان کسی دوسرے انسان پر اعتماد کر کے اس کے حوالے کرتا ہے۔ اسی طرح عہد سے مراد وہ عہد بھی ہیں جو بندہ اپنے خلائق سے کرتا ہے، اور وہ عہد بھی جو بندہ سے ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کی امانتوں اور دونوں قسم کے عہد و پیمان کا پاس و لحاظ ایک مومن کی سیرت کے لازمی خصائص میں سے ہے۔ حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے جو تقریر بھی فرماتے اس میں یہ بات ضرور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اَلَا اِيْمَانٌ لِّمَنْ لَا اِمَانَةَ لَدُوْلَا دِيْنٍ لِّمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ ۗ خَيْرٌ وَّارِثُوْهُ جِسْمِ اِمَانَتٍ نَّبِيْنِ اِسْ كَا كُوْنِيْ اِيْمَانٍ نَّبِيْنِ، اور جو عہد کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں، اَللّٰهُ يَتَّقِيْ فِيْ شُكْبِ الْاِيْمَانِ ۗ

۱۲ یعنی نہ شہادت چھپاتے ہیں، نہ اس میں کوئی کمی بیشی کرتے ہیں۔

۱۳ اس سے نماز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جس بلند سیرت و کردار کے لوگ خدا کی جنت کے مستحق قرار دیے گئے ہیں ان کی صفات کا ذکر نماز ہی سے شروع اور اسی پر ختم کیا گیا ہے نمازی ہونا ان کی پہلی صفت ہے، نماز کا ہمیشہ پابند رہنا ان کی دوسری صفت، اور نماز کی حفاظت کرنا ان کی آخری صفت۔ نماز کی حفاظت سے بہت سی چیزیں مراد ہیں۔ وقت پر نماز ادا کرنا۔ نماز سے پہلے بیہوشی یا کھانا کھانے اور کپڑے پاک ہیں۔ با وضو ہونا اور وضو میں اعضاء کو اچھی طرح دھونا۔ ارکان اور واجبات اور مستحبات نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔ نماز کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھنا۔ خدا کی نافرمانیاں کر کے اپنی نمازوں کو ضائع نہ کرنا۔ یہ سب چیزیں نماز کی حفاظت میں شامل ہیں۔

۱۴ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوت قرآن کی آواز سن کر مذاق

اڑانے اور آواز سے کہنے کے لئے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے۔

أَيُّطَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمَ أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا إِنَّا
خَلَقْنَاهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾ فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغْرِبِ

کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کر دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں سچ جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اُسے یہ خود جانتے ہیں۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی

۵۲۵ مطلب یہ ہے کہ خدا کی جنت تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کی صفات ایسی ہی جیسا کہ بیان کی جا چکی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ جو حق بات سننا تک گوارا نہیں کرتے اور حق کی آواز کو دبا دینے کے لیے یوں دوڑے چلے آ رہے ہیں جنت کے امیدوار ہو سکتے ہیں؟ کیا خدا نے اپنی جنت ایسے ہی لوگوں کے لیے بنائی ہے؟ اس مقام پر سورۃ القلم کی آیات ۳۴-۴۱ بھی پیش نظر رکھنی چاہیں جن میں کفار کہہ کو ان کی اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ آخرت اگر ہوئی بھی تو وہاں وہ اسی طرح مزے کھیں گے جس طرح دنیا میں کر رہے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا تو اے اسی طرح خستہ حال رہیں گے جس طرح آج دنیا میں ہیں۔

۵۲۶ اس مقام پر اس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ مضمون سابق کے ساتھ اس کا تعلق مانا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ جس مادے سے یہ لوگ بنے ہیں اس کے لحاظ سے تو سب انسان یکساں ہیں۔ اگر وہ مادہ ہی انسان کے جنت میں جانے کا سبب ہو تو نیک و بد، ظالم و عادل، مجرم اور بے گناہ، سب ہی کو جنت میں جانا چاہیے۔ لیکن معمولی عقل ہی یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جنت کا استحقاق انسان کے مادہ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اُس کے اوصاف کے لحاظ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس فقرے کو بعد کے مضمون کی تہمید سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہمارے عذاب سے محفوظ سمجھ رہے ہیں اور جو شخص انہیں ہماری پکڑ سے ڈراتا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ ہم ان کو دنیا میں بھی جب چاہیں عذاب دے سکتے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے بھی جب چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ یہ خود جانتے ہیں کہ نطفے کی ایک حقیر سی بوند سے ان کی تخلیق کی ابتدا کر کے ہم نے ان کو چلتا پھرتا انسان بنایا ہے۔ اگر اپنی اس خلقت پر یہ غور کرتے تو انہیں کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہوتی کہ اب یہ ہماری گرفت سے باہر ہو گئے ہیں، یا ہم انہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

۵۲۷ یعنی بات وہ نہیں ہے جو انہوں نے سمجھ رکھی ہے۔

۵۲۸ یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔ مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویے سے طلوع اور نئے زاویے پر غروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے درپے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا

إِنَّا لَقَادِرُونَ ﴿۳۱﴾ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿۳۲﴾
 فَذَرَهُمْ يَمْخُضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلْقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ
 يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴿۳۴﴾ خَاشِعَةً
 أَبْصَارُهُمْ تَرَاهُمْ ذَلِيلَةً ﴿۳۵﴾ ذَلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۳۶﴾

ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے۔
 لہذا انہیں اپنی بیہودہ باتوں اور اپنے کھیل میں پڑا رہنے دو یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس کا
 ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے، جب یہ اپنی قبروں سے نکلیں گے اس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے
 بتوں کے استخوانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں، ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ذلت ان پر چھا رہی ہوگی۔
 وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے ۷

ہے۔ ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور
 جنوب کے مقابلے میں ایک جہت مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب۔ اس بنا پر سورہ شعراء، آیت ۶۸، اور
 سورہ نزل، آیت ۱۹ میں رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے
 زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں کیونکہ جب زمین کے ایک نصف گڑے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے
 پر طلوع ہوتا ہے۔ اس بنا پر سورہ رحمن، آیت ۷، میں رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ کے الفاظ استعمال
 فرمائے گئے ہیں نیز پندرہ شرح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، الرحمن، حاشیہ ۷۱۔

۵۲۹ یہ ہے وہ بات جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رب المشارق والمغرب ہونے کی قسم کھائی ہے اس
 کے معنی یہ ہیں کہ ہم چونکہ مشرقوں اور مغربوں کے مالک ہیں اس لیے پوری زمین ہمارے قبضہ قدرت میں ہے اور
 ہماری گرفت سے بچ نکلنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں تمہیں ہلاک کر سکتے ہیں اور تمہاری جگہ کسی
 دوسری قوم کو اٹھا سکتے ہیں جو تم سے بہتر ہو۔

۵۳۰ اصل الفاظ میں اِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ۔ نَصَب کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، ان میں سے بعض نے
 اس سے مراد بت لیے ہیں اور ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اور مشرک تفریق کی ہوئی جگہ کی طرف اس طرح دوڑے جا رہے
 ہوں گے جیسے آج وہ اپنے بتوں کے استخوانوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد وہ نشان لیے
 ہیں جو دوڑ کا مقابلہ کرنے والوں کے لیے لگائے جاتے ہیں تاکہ ہر ایک دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔